



1960ء سے 1980ء تک اردو افسانہ: جدیدیت، صنعتی تبدیلی اور طبقاتی شعور

The Urdu Short Story from 1960 to 1980: Modernism, Industrial Change, and Class Consciousness

عبدالحفیظ اقبال

پی ایچ۔ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر محمد عطاء اللہ

صدر شعبہ اردو، لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور

Abstract:

This study examines the relationship between modernism, social consciousness, nature, and class conflict in Urdu fiction, with particular attention to the period from the 1960s to the 1980s. The article explores how modernist thought transformed narrative structure, characterization, language, and thematic concerns in Urdu short stories and fiction. It highlights the growing emphasis on psychological conflict, alienation, urbanization, industrial development, social inequality, and the changing relationship between human beings and their natural environment. The discussion further investigates how nature—through images of land, fields, weather, trees, water, drought, and seasonal conditions—functions not merely as background but as a symbolic medium for representing poverty, labour, deprivation, resilience, and class-based power relations. The article also considers the effects of industrial and urban development on human relationships, family structures, emotional life, and social values. Selected works of writers such as Krishan Chander, Rajinder Singh Bedi, Saadat Hasan Manto, Ahmad Nadeem Qasmi, and Intizar Hussain are discussed to demonstrate how Urdu fiction reflects the tensions between modernization and social inequality. The study concludes that modern Urdu fiction uses psychological realism, symbolism, environmental imagery, and experimental narrative techniques to portray the complex interaction between modernity, class struggle, human experience, and social change.

Keyword:

Modernism, Urdu Fiction, Social Consciousness, Class Conflict, Nature, Industrialization, Urbanization, Psychological Realism, Social Inequality, Symbolism

جدیدیت (Modernism) ادب، فنون لطیفہ، عمرانیات اور فلسفہ میں ایک ہمہ جہت فکری اور تخلیقی تحریک کے طور پر سامنے آئی، جس کا ظہور انیسویں صدی کے آخری حصے اور بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ہوا۔ اس تحریک کی بنیادی روح روایت سے انحراف اور ماضی کی تقلید سے انکار میں مضمر ہے، جس کے ذریعے حقیقت اور زندگی کو ایک نئے زاویہ نظر سے سمجھنے کی



کوشش کی گئی۔ جدیدیت نے ہر اس فکری، اسلوبی اور رویہ جاتی جمود کو چیلنج کیا جو روایت پرستی اور تقلید کے اصولوں پر قائم تھا، اور اس کے برعکس نئے تجربات، نئے اسالیب اور نئی معنویت کی جستجو کو فروغ دیا۔

یہ محض ایک ادبی رجحان نہیں بلکہ ایک وسیع تہذیبی اور فکری تحریک ہے جس کے اثرات فلسفہ، مصوری، موسیقی، نفسیات اور سماجیات تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جدیدیت کا بنیادی تصور یہی تھا کہ سوچ، مشاہدہ اور اظہار کو نئے سانچے میں ڈھالا جائے۔ اس تحریک نے انسانی انفرادیت کو مرکزِ توجہ بنایا اور فرد کی ذات، اس کے داخلی تجربات اور نفسیاتی کیفیات کو اہمیت دی۔ اس کے نتیجے میں کلاسیکی اور روایتی اقدار سے بغاوت سامنے آئی، جبکہ علامتی اور تجریدی اظہار کے ذریعے نئے استعارے اور علامات تخلیق کیے گئے۔ خارجی واقعات کے بجائے انسان کی داخلی دنیا کو موضوع بنایا گیا، جس میں خود آگاہی، تشکیک اور اضطراب کو بنیادی اہمیت حاصل ہوئی۔

جدیدیت نے اظہار کی آزادی کو فروغ دیا اور اصناف و اسالیب کی روایتی حدود کو توڑ دیا، جس کے نتیجے میں آزاد نظم اور علامتی افسانہ جیسے نئے ادبی تجربات سامنے آئے۔ مزید برآں، اس تحریک نے جدید علوم سے بھی گہرا اثر قبول کیا، خصوصاً نفسیات، عمرانیات اور فلسفے سے۔ فرائیڈ کے نظریہ لاشعور، نیٹشے اور ہائیڈیگر کے فلسفیانہ افکار، اور سائنسی ترقیات نے ادب کی فکری جہتوں کو وسعت دی۔ تاہم، جدیدیت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی رہا کہ اس نے اجتماعی مسائل کے بجائے زیادہ تر فرد کے ذاتی اور داخلی تجربات کو موضوع بنایا۔

جدیدیت کے ظہور کے پس منظر میں متعدد عوامل کار فرما تھے۔ سائنسی ایجادات اور صنعتی انقلاب نے انسانی زندگی کے طور طریقوں کو یکسر بدل دیا۔ مشین، ریل، بجلی اور ٹیلی فون جیسی اختراعات نے نہ صرف معاشرتی ڈھانچے کو متاثر کیا بلکہ انسانی شعور کو بھی نئی سمت دی۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم نے انسانی وجود، تہذیبی اقدار اور اخلاقی نظام پر گہرے سوالات اٹھائے، جس سے فکری بے یقینی اور اضطراب میں اضافہ ہوا۔ فلسفیانہ سطح پر نیٹشے کے نظریہ "خدا کی موت"، برگساں کے تصور تخلیقی ارتقاء، اور مارکس کی معاشی تعبیر تاریخ نے ادب میں نئے فکری رجحانات کو جنم دیا۔ اسی طرح فرائیڈ کے نظریہ لاشعور نے ادیبوں کو انسانی باطن اور نفسیاتی پیچیدگیوں کی طرف متوجہ کیا۔



نوآبادیاتی تجربات اور سامراجی قوتوں کے اثرات نے بھی جدیدیت کو تقویت دی، جہاں مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے تصادم نے شناخت کے بحران کو جنم دیا۔ شہری زندگی میں تنہائی، مشینی پن اور انسانی تعلقات کی اجنبیت بھی جدید ادب کے اہم موضوعات بنے۔ اس کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر سیاسی، سماجی اور معاشی انقلابات، جیسے روسی انقلاب اور نوآبادیاتی تحریکیں، نے بھی ادبی اظہار کو نئی جہتیں عطا کیں۔

اگر وسیع تر تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو جدیدیت کی جڑیں سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں ابھرنے والی ان تحریکوں میں پیوست نظر آتی ہیں جو کلیسائی جبر اور روایت پرستی کے خلاف اٹھیں۔ اس دور میں مذہبی اداروں کی بالادستی نے آزاد علمی تحقیق کو محدود کر رکھا تھا، مگر سائنسی اور تجرباتی علوم کی ترقی نے ان پابندیوں کو چیلنج کیا۔ عقل، تجربہ اور مشاہدہ کو علم کے بنیادی ذرائع کے طور پر تسلیم کیا گیا، جبکہ مابعد الطبیعیاتی تصورات کو رد کرتے ہوئے عقلیت پسندی کو فروغ دیا گیا۔ یوں مذہب اور فلسفہ کے درمیان ایک واضح تفریق پیدا ہوئی، جس نے جدید فکر کی بنیادوں کو مستحکم کیا۔ یوسف جمال خواجہ لکھتے ہیں:

"لفظ جدید یا جدیدیت حسب ذیل معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ الف، خالص تاریخی مفہوم: اس کے مطابق بیسویں صدی انیسویں سے اور آج گزشتہ کل سے جدید ہے خواہ اس استعمال میں تمام دوسری کیفیات کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ لغوی مفہوم کے مطابق، ہر وہ چیز یا پہلو جو مروجہ فیشن ہے، جدید کہا جائے گا چاہے وہ پسندیدہ ہو یا ناپسندیدہ ہو۔" (۱)

ایک نظریہ یہ ہے کہ جدیدیت ترقی پسندی کی توسیع ہے۔ ہر تحریک کا ردِ عمل موافقت اور مخالفت دونوں صورتوں میں ہوتا ہے۔ اس حوالے سے وحید اختر اپنے مضمون "جدیدیت کے بنیادی تصورات" میں لکھتے ہیں:

"جدیدیت کی مختصر ترین تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ یہ اپنے عہد کی زندگی کا سامنا کرنے اور اسے تمام امکانات کے ساتھ برتنے کا نام ہے" (۲)

جدیدیت دراصل ایک مخصوص فکری رویے اور سوچ کے انداز کا نام ہے۔ اس سے مراد صرف یہ نہیں کہ کوئی ادیب یا شاعر موجودہ دور میں لکھ رہا ہو۔ آج کے تخلیق کار بھی اپنے نظریات اور طرز فکر کے لحاظ سے جدیدیت پسند یا روایت پسند ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح صرف عصری شعور یا اپنے زمانے کے مسائل سے آگاہی کو بھی جدیدیت نہیں کہا جاسکتا۔ اگرچہ ہر نئی چیز اپنے عہد میں جدید سمجھی جاتی ہے، لیکن ضروری نہیں کہ وہ جدیدیت کے فکری اور ادبی تصور کی نمائندگی بھی کرے۔ آل احمد سرور لکھتے ہیں:



"ادب میں جدیدیت کا واضح تصور کی ایک خاص اہمیت یہ ہے کہ پہلے جو کام مذہب یا فلسفہ بری ہدایت تک انجام دیتا تھا اب یہ دونوں کے بس کا نہیں رہا۔ ہاں ادب اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو مذہب یا فلسفیانہ نظاموں کے ڈھیلے ہونے سے پیدا ہوا۔" (۳)

اردو ادب میں جدیدیت کے رجحان نے بالخصوص بیسویں صدی کے وسط میں نمایاں صورت اختیار کی اور شاعری و افسانے دونوں کو متاثر کیا۔ ن۔ م۔ راشد، میراجی، انتظار حسین، شمس الرحمن فاروقی اور انور سجاد جیسے ادیبوں اور ناقدین نے جدید ادبی فکر کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ جدیدیت نے مروجہ ادبی روایت سے مختلف راستہ اختیار کرتے ہوئے فرد کی داخلی زندگی، وجودی اضطراب، تنہائی، اجنبیت اور زندگی کی بے معنویت جیسے موضوعات کو اہمیت دی۔ اس اعتبار سے جدیدیت کو ایک تخلیقی اور فکری تبدیلی قرار دیا جاسکتا ہے جس نے روایتی اظہار کی حدود سے نکل کر نئے اسالیب، علامتوں اور معنوی امکانات کو جنم دیا۔ اس رجحان کی تشکیل میں انسانی شعور کی بدلتی ہوئی صورتوں، مشینی و صنعتی تہذیب، جدید فلسفیانہ افکار اور نفسیاتی نظریات نے بھی بنیادی کردار ادا کیا۔ اسی لیے بیسویں صدی کی ادبی اور فکری تاریخ کے جامع مطالعے میں جدیدیت کو ایک اہم ادبی رجحان کی حیثیت حاصل ہے۔ آل احمد سرور لکھتے ہیں:

"ہمارے ملک میں مجموعی طور پر جدیدیت انیسویں صدی سے شروع ہوتی ہے۔ یہ جدیدیت مغرب کے اثر سے آئی ہے۔ یورپ میں نشاۃ الثانیہ نے ازمہ وسطیٰ کو ختم کر دیا۔ ہمارے یہاں نشاۃ الثانیہ مغرب کے اثر سے انیسویں صدی کے وسط میں رونما ہوا۔ یورپ میں جدیدیت کی تاریخ تین سو سال سے زیادہ کی ہے۔ ہمارے یہاں سوڈیٹھ سو سال کی۔ اس لیے جدیدیت نے جو رنگ یورپ میں بدلے ہیں ان کے پیچھے کشمکش اور آویزش کی خاصی طویل تاریخ ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان میں جدیدیت نو عمر ہے اور ہندوستانی ذہن ابھی تک مجموعی طور پر، اور پورے طور پر جدید نہیں ہو سکا ہے۔" (۴)

ادب میں جدیدیت کا ایک اہم تصور یہ ہے کہ جدید دور میں مذہب اور فلسفے کی روایتی معنویت کمزور ہونے کے بعد ادب نے انسانی اور معاشرتی سطح پر پیدا ہونے والے خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے انسان کو بے مثال مادی ترقی، قوت، سہولت اور معاشی امکانات فراہم کیے، لیکن یہ ترقی انسان کی داخلی اور اخلاقی تربیت کی ضمانت نہ بن سکی۔ مشینی تہذیب نے جہاں زندگی کو آسان بنایا، وہیں تنہائی، بے معنویت، اضطراب، خود غرضی اور انسانی رشتوں کی کمزوری جیسے مسائل بھی پیدا کیے۔



انسان نے فطرت اور مادّی دنیا پر بڑی حد تک قابو حاصل کر لیا، مگر اپنے اندر موجود خواہشات، تشدد، حرص اور غیر انسانی رویوں کو مکمل طور پر قابو میں نہ لاسکا۔

اسی پس منظر میں مختلف فلسفیانہ نظریات، مثلاً وجودیت، انسان دوستی اور فلسفیانہ بشریت نے انسانی بحران کو سمجھنے اور اس کا حل پیش کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ نظریات بھی انسان کی تمام داخلی، روحانی اور معاشرتی پیچیدگیوں کا مکمل جواب فراہم نہ کر سکے۔ جدیدیت کے تناظر میں ادب کی اہمیت یہاں بڑھ جاتی ہے، کیونکہ ادب انسان کے باطن، اس کے دکھ، تنہائی، خوف، محرومی، امید اور اخلاقی کشمکش کو ایسے انداز میں سامنے لاتا ہے جو محض سائنسی یا فلسفیانہ بحث سے ممکن نہیں۔ ادب نہ صرف انسانی تجربے کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ انسان میں احساس، ہمدردی، خود آگہی اور اخلاقی شعور بھی پیدا کرتا ہے۔ اس لیے جدید فکر میں ادب کو محض تفریح یا جمالیاتی اظہار نہیں سمجھا گیا بلکہ اسے انسانی اقدار کے تحفظ، سماجی شعور کی بیداری اور انسانیت کی بقا کے لیے ایک مؤثر تخلیقی قوت کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر اشرف کمال کا خیال ہے:

"جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے درمیان جو سب سے بڑا اختلاف ہے، وہ ان دونوں کے درمیان تصور انسان کے اختلاف سے پیدا ہوتا ہے۔ 20 ویں صدی میں جب علوم کو فروغ ملا اور یونانی علوم جو کہ پہلے یورپ میں عدم مرکزیت کا شکار ہو کر رہ گئے تھے، ان کی دوبارہ ترویج و اشاعت ہوئی۔ تصور انسان جس کا بنیادی اور محوری تصور تھا۔ انسان پرستی کے فکری عہد اور تہذیبی نظام اقدار کے آئینے میں جب 20 ویں صدی کی تحریکوں وجودیت اور مارکسزم پر نظر ڈالی جائے، تو ان دونوں تحریکوں کا مرکز و محور انسان پرستی تھا۔ سارتر کے مشہور و مقبول الفاظ ”وجودیت انسان پرستی ہے“ نے فکری طور پر جس انسانیت کی بات کی وہ ۲۰ ویں صدی ہی میں جدیدیت اور وجودیت کے طے میں گم ہو کر رہ گیا۔ دونوں ہی فکری نظام اپنے تصور انسان کے ساتھ ڈوب گئے، یوں وہ انسان ریزہ ریزہ ہو کر انجانی فضاؤں میں گم ہو گیا جس کی بنا پر یہ نظریات قائم کیے گئے اور ان فکری تحریکوں سے وابستہ ڈسکورس بھی تاریخ کی گرد میں گم ہو گیا۔" (۵)

جدیدیت بنیادی طور پر جدید عہد کے مخصوص تاریخی، سماجی اور تہذیبی حالات سے جنم لینے والا فکری و ادبی رویہ ہے۔ اس کی تشکیل میں صنعتی ترقی، سائنسی ایجادات، مشینی تمدن، شہری زندگی اور تیزی سے بدلتے ہوئے معاشرتی تعلقات نے اہم کردار ادا کیا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے اگرچہ انسان کو بے شمار سہولتیں فراہم کیں اور اس کی مادی قوت میں اضافہ کیا، لیکن دوسری طرف مشینی زندگی نے فرد کے داخلی وجود کو بھی متاثر کیا۔ نتیجتاً تنہائی، اجنبیت، بے معنویت، اضطراب اور انسانی رشتوں میں کمزوری جیسے



احساسات جدید انسان کے تجربے کا حصہ بن گئے۔ معاشرتی سطح پر بھی فرد اور اجتماع کے درمیان فاصلے بڑھے اور روایتی سماجی ساخت میں انتشار پیدا ہوا۔

تاہم جدیدیت کے تجربے کو پوری دنیا میں یکساں قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مغرب اور مشرق کے تاریخی اور تہذیبی حالات مختلف رہے ہیں، جس طرح شہری اور دیہی معاشروں یا بڑے اور چھوٹے شہروں کے تجربات میں فرق پایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود جدید سائنس، ذرائع نقل و حمل، مواصلاتی ٹیکنالوجی اور ذرائع ابلاغ نے دنیا کو بندرتیغ ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ آج کسی ایک خطے کا سیاسی، معاشی یا ماحولیاتی مسئلہ بہت جلد عالمی اہمیت اختیار کر سکتا ہے۔ ایٹمی ہتھیاروں کا خطرہ، جنگیں، معاشی بحران اور ماحولیاتی مسائل ایسی مثالیں ہیں جن کے اثرات جغرافیائی حدود تک محدود نہیں رہتے۔ اسی عالمی رابطے کے نتیجے میں جدیدیت بھی مغربی ادب تک محدود نہ رہی بلکہ مختلف زبانوں اور تہذیبوں کے ادب میں اپنے مقامی حالات کے مطابق نئی صورتوں میں ظاہر ہوئی۔

ادبی سطح پر جدیدیت نے موضوع اور اسلوب دونوں میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کیں۔ روایتی قصے، مربوط پلاٹ اور غیر معمولی ہیرو کی جگہ عام انسان اور اس کے روزمرہ تجربات کو اہمیت حاصل ہوئی۔ جدید ادیب نے خارجی واقعات کے ساتھ انسانی ذہن کی پیچیدہ داخلی دنیا کو موضوع بنایا۔ اسی وجہ سے شعور کی روانہ (Stream of Consciousness)، داخلی خود کلامی، علامت، استعارہ اور اشاریت جیسے فنی وسائل زیادہ نمایاں ہوئے۔ حقیقت کو سیدھے اور مسلسل بیانے میں پیش کرنے کے بجائے یادداشت، خواب، تاثرات، منتشر خیالات اور شکستہ زمانی ترتیب کے ذریعے پیش کرنے کا رجحان بڑھا۔ اس طرح جدید ادب نے صرف نئے موضوعات ہی اختیار نہیں کیے بلکہ اظہار کے مروجہ طریقوں کو بھی تبدیل کیا۔

جدیدیت میں زبان محض معلومات منتقل کرنے کا وسیلہ نہیں رہتی بلکہ خود تخلیقی تجربے کا حصہ بن جاتی ہے۔ ایک ہی لفظ مختلف سیاق و سباق میں مختلف معنوی جہات پیدا کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید ادب میں ابہام، کثیر المعنویت اور علامتی اظہار کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ زبان اور معنی کے باہمی تعلق سے متعلق یہ مسئلہ بیسویں صدی کے فلسفہ زبان میں بھی اہم رہا، خصوصاً Ludwig Wittgenstein کے افکار میں معنی اور زبان کے استعمال کے تعلق کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس تناظر میں جدید ادبی متن قاری کو تیار شدہ معنی فراہم کرنے کے بجائے معنی کی تشکیل کے عمل میں شریک کرتا ہے۔



اردو ادب میں جدید رجحانات کی بنیادیں تقسیم ہند سے پہلے بھی موجود تھیں، بالخصوص ن۔م۔راشد اور میراجی کی شاعری میں، تاہم تقسیم ہند کے بعد پیدا ہونے والے سیاسی، سماجی اور نفسیاتی بحرانوں نے جدید حسیت کو مزید شدت عطا کی۔ 1947ء کی تقسیم نے ہجرت، تشدد، شناخت، بے وطنی، انسانی رشتوں کی شکست اور تہذیبی انتشار جیسے مسائل پیدا کیے، جو بعد کے اردو ادب کے اہم موضوعات بنے۔ صنعتی اور شہری تبدیلیوں نے بھی فرد کے تجربے اور ادبی اظہار کی صورتوں کو متاثر کیا۔

افسانے میں Saadat Hasan Manto کی "کھول دو" اور "ٹھنڈا گوشت" تقسیم سے پیدا ہونے والے انسانی المیے کی نمایاں مثالیں ہیں، جبکہ Rajinder Singh Bedi کی "لاجونی" تقسیم، انسانی نفسیات اور سماجی رویوں کے پیچیدہ پہلوؤں کو سامنے لاتی ہے۔ شاعری میں N. M. Rashid اور Meeraji نے آزاد نظم، نئی علامتوں، نفسیاتی تجربات اور انفرادی شعور کے ذریعے اردو شاعری کے روایتی سانچوں کو وسعت دی۔

مغربی ادب میں جدیدیت کی اہم مثالوں میں James Joyce کا *Ulysses*، T. S. Eliot کی *The Waste Land* اور Virginia Woolf کا *Mrs Dalloway* شامل ہیں۔ ان تخلیقات میں منتشر جدید زندگی، داخلی شعور، زمانی شکست و ریخت اور روایتی بیانیے سے انحراف نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔

جدیدیت اور مابعد جدیدیت (Postmodernism) میں امتیاز ضروری ہے۔ جدیدیت نے روایت سے انحراف کرتے ہوئے نئے فکری اور فنی امکانات تلاش کیے، جبکہ مابعد جدیدیت نے خود حقیقت، معنی، مرکزیت اور کسی ایک حتمی تعبیر کے تصور پر سوال اٹھایا۔ دوسری عالمی جنگ، ایٹمی تباہی، سرد جنگ، ذرائع ابلاغ کے غیر معمولی پھیلاؤ، صارفیت اور تیز رفتار ٹیکنالوجی نے ایسے حالات پیدا کیے جن میں ایک واحد اور قطعی حقیقت کا تصور مزید متنازع ہو گیا۔ اس کے مقابلے میں مختلف زاویوں، متبادل تعبیرات اور کثیر حقیقتوں کو اہمیت حاصل ہوئی۔

مابعد جدید ادب میں مربوط اور خطی بیانیے کی جگہ شکستہ یا غیر خطی بیانیہ، طنز، ہیروڈی، خود انعکاسیت اور بین المتونیت (Intertextuality) جیسے رجحانات نمایاں ہوئے۔ حقیقت اور فکشن کی سرحدوں کو بھی شعوری طور پر دھندلا کیا گیا۔ اسی طرح زبان کے معنی کو مستقل اور قطعی سمجھنے کے بجائے متغیر اور سیاق سے وابستہ تصور کیا گیا، جبکہ مصنف کو متن کے معنی کا واحد حاکم



سمجھنے کے تصور کو بھی چیلنج کیا گیا۔ تاریخ کو بھی ایک غیر جانب دار اور حتمی بیان کے بجائے مختلف نقطہ ہائے نظر سے تشکیل پانے والے بیانیے کے طور پر دیکھنے کا رجحان سامنے آیا۔

مغربی ادب میں Thomas Pynchon کا *Gravity's Rainbow* اور Italo Calvino کا *If on a winter's night a traveler* مابعد جدید فکشن کی معروف مثالیں ہیں۔ اردو ادب میں بھی بیانیے کی شکست، اساطیری و تاریخی حوالوں، بین المتونیت اور حقیقت کی مختلف تعبیرات کے تجربات ملتے ہیں، اگرچہ ہر تجرباتی یا علامتی ادیب کو براہ راست مابعد جدید قرار دینا تنقیدی طور پر احتیاط کا تقاضا کرتا ہے۔

یوں جدیدیت کو جدید انسان کے بحران، تنہائی اور نئی معنویت کی تلاش سے وابستہ کیا جاسکتا ہے، جبکہ مابعد جدیدیت خود معنی، حقیقت اور مرکزیت کے مستحکم تصورات پر سوال قائم کرتی ہے۔ اس اعتبار سے دونوں رجحانات محض ادبی اسالیب نہیں بلکہ اپنے اپنے عہد کی علمی، سماجی، سیاسی اور تہذیبی تبدیلیوں کے فکری و تخلیقی اظہار بھی ہیں۔

جدیدیت (Modernism) بیسویں صدی کے آغاز میں مغرب میں ابھرنے والا ایک اہم فکری اور ادبی رجحان تھا جس نے روایتی موضوعات، اسالیب اور بیانیہ تکنیکوں سے انحراف کرتے ہوئے جدید انسان کے پیچیدہ تجربات کو نئے انداز میں پیش کیا۔ اردو افسانے میں جدید رجحانات کی بنیادیں پہلے سے موجود تھیں، تاہم 1950ء اور بالخصوص 1960ء کے بعد جدید افسانے کی فنی شناخت زیادہ نمایاں ہوئی۔ جدید انسان کے ذہنی انتشار، تنہائی، بے یقینی اور داخلی کشمکش کے اظہار کے لیے علامت، استعارہ، اشاریت، ابہام اور شعور کی رو جیسی تکنیکوں کو اہمیت حاصل ہوئی۔ یوں افسانہ خارجی واقعات کے بیان سے آگے بڑھ کر انسانی باطن اور نفسیاتی پیچیدگیوں کی ترجمانی کرنے لگا۔

جدید افسانہ اپنی تکنیک اور طرزِ اظہار کے اعتبار سے روایتی اور ترقی پسند افسانے سے مختلف نظر آتا ہے۔ اس میں مربوط پلاٹ اور روایتی کردار نگاری کے بجائے داخلی کیفیات، منتشر تجربات اور علامتی اظہار کو اہمیت دی گئی۔ زبان بھی محض واقعات بیان کرنے کا وسیلہ نہیں رہی بلکہ اسے تخلیقی اور استعاراتی انداز میں استعمال کیا جانے لگا۔ Saadat Hasan Manto نے انسانی نفسیات، جنس، تشدد اور معاشرتی منافقت کو بے باکی سے پیش کیا، جبکہ Krishan اور Rajinder Singh Bedi Chander کے ہاں انسانی رشتوں، طبقاتی تفاوت، غربت اور سماجی نا انصافی کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔



1960ء سے 1980ء تک کا زمانہ اردو ادب کے لیے ایک اہم انتقالی دور تھا۔ پاکستان میں سیاسی عدم استحکام، صنعتی ترقی، تیزی سے بڑھتی ہوئی شہری زندگی، طبقاتی تفاوت اور ہجرت کے اثرات نے ادبی شعور کو متاثر کیا۔ بالخصوص 1971ء کے سانحے اور بعد ازاں 1977ء میں فوجی حکومت کے قیام نے اجتماعی اور انفرادی سطح پر بے یقینی اور اضطراب کو بڑھایا۔ ان حالات کے نتیجے میں اردو افسانے میں شناخت، تنہائی، شکستِ ذات، سماجی ناہمواری، عورت کے مسائل، غربت اور شہری و دیہی تضادات جیسے موضوعات زیادہ نمایاں ہوئے۔ افسانہ نگاروں نے خارجی حقیقت کے ساتھ کرداروں کی داخلی اور نفسیاتی دنیا کو بھی اپنی تخلیقات کا مرکز بنایا۔

اسی عرصے میں مابعد جدید رجحانات کے ابتدائی آثار بھی سامنے آنے لگے۔ مابعد جدیدیت (Postmodernism) نے کسی ایک قطعی حقیقت کے تصور کے بجائے حقیقت کی کثرت، مختلف نقطہ ہائے نظر اور معنی کی غیر قطعیت کو اہمیت دی۔ اس کے زیر اثر غیر خطی اور شکستہ بیانیہ، بین المتونیت، ماضی اور حال کا امتزاج اور حقیقت و فکشن کی سرحدوں کو دھندلا کرنے جیسے تجربات سامنے آئے۔ Intizar Hussain کے فکشن میں یادداشت، ہجرت، اساطیر اور ماضی و حال کا تعلق اس بدلتے ہوئے ادبی شعور کی اہم مثال ہے۔

اردو افسانے میں فطرت بھی محض منظر نگاری تک محدود نہیں رہتی بلکہ سماجی اور طبقاتی حقیقت کی علامت بن جاتی ہے۔ زمین، کھیت، درخت، دریا، موسم، بارش اور خشک سالی جیسے عناصر کرداروں کے معاشی حالات، محرومیوں اور نفسیاتی کیفیتوں کو نمایاں کرتے ہیں۔ خصوصاً دیہی افسانے میں زمین ملکیت، طاقت اور طبقاتی شناخت کی علامت بن سکتی ہے، جبکہ موسم اور قدرتی حالات محروم طبقے کی جدوجہد اور بے بسی کو زیادہ مؤثر انداز میں سامنے لاتے ہیں۔ کرشن چندر کے افسانوں میں غربت اور طبقاتی ناہمواری کے ساتھ ماحول اور فطرت کا تعلق اسی تناظر میں اہمیت اختیار کرتا ہے۔

اس طرح 1950ء کے بعد اردو افسانہ بندرتجربہ روایتی بیانیے سے نکل کر نفسیاتی گہرائی، علامتیت، داخلی تجربے اور فنی تجربہ کاری کی طرف بڑھا، جبکہ بعد کے عشروں میں حقیقت کی کثرت، یادداشت اور غیر روایتی بیانیے نے نئے امکانات پیدا کیے۔ یہ تبدیلیاں اردو افسانے کو جدید معاشرے کے سیاسی، سماجی، طبقاتی اور نفسیاتی مسائل کے اظہار کا ایک مؤثر وسیلہ بناتی ہیں۔ ایک اقتباس میں کالو کی زندگی کی مسلسل جدوجہد کو بیان کیا گیا ہے۔

"وہ خود پرے ہٹ گیا ہے ایک بھنگی کی طرح ہٹ کر کھڑا ہو گیا ہے، حتیٰ کہ داستان شروع ہو کر ختم بھی

ہو گئی ہے، لیکن کالو بھنگی بدستور اپنی جھاڑو سنبھالے اسی طرح کھڑا ہے۔" (۶)



یہ کالو کی مسلسل جدوجہد اور سماجی امتیاز کی عکاسی کرتا ہے، جہاں فطرت اس کی حالت زار کا آئینہ بن جاتی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ "گرم کوٹ" راجندر سنگھ بیدی کے افسانے "گرم کوٹ" میں فطرت اور طبقاتی کشمکش کا تعلق انسانی جذبات اور معاشی حالات سے جوڑا گیا ہے۔ افسانے میں ایک شخص کی سردی سے بچنے کی آرزو اور اس کی مالی مشکلات کو پیش کیا گیا ہے۔ ایک اقتباس میں اس کی حالت بیان کی گئی ہے:

یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جسے ایک گرم کوٹ کی شدید ضرورت ہے۔ پرانے کوٹ پر پیوند لگاتے ہوئے وہ اور اسکی بیوی دونوں تھک گئے ہیں۔" (۷)

یہ فطرت، خصوصاً سردی، محض موسمی کیفیت نہیں بلکہ غربت اور طبقاتی محرومی کو نمایاں کرنے کا ایک مؤثر وسیلہ بھی ہے۔ شدید سردی کے اثرات معاشی طور پر کمزور افراد کے لیے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوتے ہیں، اس لیے فطری ماحول کرداروں کی روزمرہ مشکلات اور سماجی ناہمواری کو مزید نمایاں کرتا ہے۔ اسی طرح سعادت حسن منٹو کے افسانے "بو" میں فطری اور حسی عناصر انسانی خواہش، جسمانی کشش اور سماجی طبقاتی فرق کے اظہار سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ منٹو، جو جسم اور ماحول کے حسی تجربے کے ذریعے کردار کی داخلی کیفیت کو سامنے لاتے ہیں۔ اس طرح افسانے میں فطرت اور حسی تجربہ صرف پس منظر نہیں رہتے بلکہ انسانی نفسیات، خواہش اور طبقاتی امتیاز کو سمجھنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

"رحمت خداوندی کے پھول یہ ایک ایسے شرابی شخص کی کہانی ہے جو جتنا بڑا شرابی ہے، اتنا ہی بڑا کنجوس بھی ہے۔ وہ دوستوں کے ساتھ شراب پینے سے بچتا ہے، کیونکہ اس سے اسے زیادہ روپیے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔" (۸)

یہ اقتباس فطرت، طبقاتی کشمکش اور انسانی نفسیات کے باہمی تعلق کو نمایاں کرتا ہے۔ منٹو کے افسانہ "بو" میں خوشبو محض ایک حسی کیفیت نہیں بلکہ جنسی خواہش، طبقاتی فرق اور انسانی باطن کی علامت بن جاتی ہے۔ اسی طرح کرشن چندر، بیدی اور دیگر افسانہ نگاروں نے فطرت کو کرداروں کی غربت، جذبات اور سماجی محرومیوں کے اظہار کے لیے استعمال کیا۔

1960ء سے 1980ء کے دوران صنعتی ترقی نے اردو افسانے پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ صنعت کاری نے روزگار، شہری ترقی، تعلیم اور سماجی تبدیلی کے نئے امکانات پیدا کیے، لیکن اس کے ساتھ آلودگی، مزدوروں کے استحصال، طبقاتی تفاوت، دیہی زندگی کے زوال اور انسانی رشتوں میں کمزوری جیسے مسائل بھی سامنے آئے۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، منٹو اور



احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانوں میں ان تبدیلیوں کو کرداروں کی نفسیات، معاشرتی تعلقات اور طبقاتی کشمکش کے ذریعے پیش کیا۔ اس طرح اس دور کا اردو افسانہ صنعتی ترقی کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کی مؤثر عکاسی کرتا ہے۔

"وہ ہلکا سا خوش تھا کہ آج کا کام ختم ہوا اور کل پھر سے مزدوری ملے گی۔ (۹)"

یہ اقتباس اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ صنعتی اور شہری ترقی نے نچلے اور متوسط طبقے کی زندگی میں بعض معاشی آسانیاں پیدا کیں۔ روزگار کے نئے مواقع، بہتر ذرائع نقل و حمل، تعلیم اور صحت کی سہولیات نے شہری زندگی کو نسبتاً منظم اور سہل بنایا۔ بعض کرداروں کے لیے معمولی معاشی بہتری بھی خوشی، امید اور بہتر مستقبل کے احساس کا سبب بنتی ہے۔ تاہم یہ ترقی تمام طبقات کے لیے یکساں فائدہ مند نہیں رہی، کیونکہ معاشی وسائل کی تقسیم میں عدم مساوات برقرار رہی۔

انتظار حسین کے ناول "بستی" میں شہری زندگی، بدلتے ہوئے سماجی حالات اور جدید سہولیات کے ساتھ انسانی تجربے کی پیچیدگی کو پیش کیا گیا ہے۔ شہر میں تعلیم، علاج، مواصلات اور دیگر سہولتوں کی موجودگی زندگی کو آسان بناتی ہے، لیکن اسی شہری ماحول میں بے چینی، ہجرت، شناخت کا بحران اور جذباتی تناؤ بھی بڑھتا ہے۔ اس طرح شہری ترقی ایک طرف سہولت اور امکانات فراہم کرتی ہے، جبکہ دوسری طرف فرد کو اپنے ماضی، روایت اور سماجی وابستگی سے دور بھی کر سکتی ہے۔

کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں طبقاتی فرق زیادہ نمایاں صورت میں سامنے آتا ہے۔ ان کے ہاں مزدور، غریب، جاگیردار، سرمایہ دار، مالک اور بنیاد مختلف معاشی طبقات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ محنت کرنے والا طبقہ اکثر وسائل پیدا کرتا ہے لیکن ان وسائل سے حقیقی فائدہ طاقتور اور صاحب حیثیت طبقہ اٹھاتا ہے۔ مزدور کی محنت، غربت، کم اجرت اور معاشی مجبوری کے مقابلے میں مالکان اور جاگیرداروں کی آسودگی سماجی عدم مساوات کو واضح کرتی ہے۔

ان افسانوں میں استحصال صرف معاشی سطح تک محدود نہیں رہتا بلکہ سماجی اور نفسیاتی سطح پر بھی ظاہر ہوتا ہے۔ غریب کردار اپنی بنیادی ضروریات، عزت نفس اور بہتر مستقبل کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے ہیں، جبکہ طاقتور طبقہ اپنے معاشی اثر و رسوخ کے ذریعے ان پر بالادستی قائم رکھتا ہے۔ اسی طرح بنیادیں ہوا کار قرض، سود اور معاشی انحصار کے ذریعے کمزور طبقے کو مزید مشکلات میں مبتلا کرتا ہے۔



اس طرح اردو افسانہ صنعتی اور شہری ترقی کو نہ مکمل طور پر مثبت قرار دیتا ہے اور نہ منفی۔ ادیب یہ دکھاتے ہیں کہ ترقی سے سہولیات اور روزگار کے مواقع تو پیدا ہوتے ہیں، لیکن اگر وسائل کی منصفانہ تقسیم نہ ہو تو یہی ترقی طبقاتی فرق، استحصال اور سماجی بے چینی میں اضافہ کر سکتی ہے۔ یہی تضاد کرشن چندر اور بیدی کے افسانوی ادب کو سماجی اور طبقاتی مطالعے کے لیے اہم بناتا ہے۔

"بھات روپے کا ایک سیر تھا لیکن ہم لوگ اس پر بھی خدا کا شکر بجالاتے، جس نے چاول کھلائے،۔۔۔ اور پھر بھات مدم ہو گیا۔ پھر درختوں پر سے آم جامن، کیٹل، شریفے، کیلے ختم ہو گئے، تاڑی ختم، ساگ سبزی ختم، ناریل ختم، کہتے ہیں زمیندار کے پاس منوں اناج تھا اور بننے کے پاس بھی، لیکن کہاں تھا، کس جگہ تھا؟ کسی کو معلوم نہ تھا، اناج حاصل کرنے کی تمام تدبیریں رائگاں گئیں۔ گرگڑانا، مٹیں کرنا، خدا سے دعا مانگنا، خدا کو دھمکی دینا، سب کچھ ختم ہو گیا، صرف اللہ کا نام باقی تھا یا زمیندار اور بننے کا گھر" (۱۰)

یہ اقتباس مزدور کی محنت اور زمین یا وسائل پر ان کے محدود حقوق کو ظاہر کرتا ہے۔ دیہی زندگی اور زمین سے رشتہ صنعتی ترقی نے دیہی زندگی کے قدیم رشتوں اور زمین سے جڑت کو کمزور کیا:

"ملک یوں بنتے ہیں پکے مکان اور یوں رہتے ہیں پکے مکانوں میں، بھاگی نے کہا۔ ملک تو پھر کہے گا شرم کرو بشکو، شرم کرو، تو میں کہوں گا۔ اللہ بخش بولا، ملک جی شرم کا ہے کی کروں، اب تو میرا شیش محل، میرا شیش محل ہے۔" (۱۱)

شہری اور صنعتی ماحول نے انسان کی داخلی زندگی، جذباتی کیفیت اور خاندانی تعلقات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ تیز رفتار شہری زندگی، فیکٹریوں کے قیام اور صنعتی سرگرمیوں نے جہاں معاشی ترقی اور روزگار کے مواقع پیدا کیے، وہیں ذہنی دباؤ، تنہائی، خاندانی فاصلے اور جذباتی بے چینی کو بھی بڑھایا۔ اردو افسانہ نگاروں نے ان تبدیلیوں کو محض سماجی پس منظر کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ کرداروں کی نفسیات اور ان کے باہمی تعلقات کے ساتھ جوڑ کر دکھایا۔

صنعتی ترقی کے باعث پیدا ہونے والی ماحولیاتی آلودگی، فطری ماحول کی تباہی اور شہری پھیلاؤ بھی افسانوی ادب کے اہم موضوعات بنے۔ زمین، درخت، دریا، کھیت اور موسم جیسے فطری عناصر اکثر غربت، محرومی، محنت، آزادی اور طاقت کے فرق کی علامت بن جاتے ہیں۔ اس طرح فطرت طبقاتی کشمکش کو واضح کرنے کا ایک مؤثر ادبی وسیلہ بن جاتی ہے۔



اردو افسانے میں صنعتی ترقی کو ایک دورِ نئی عمل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ایک طرف یہ روزگار، تعلیم، شہری سہولیات اور معاشی بہتری فراہم کرتی ہے، جبکہ دوسری طرف طبقاتی تفاوت، مزدوروں کے استحصال، دیہی زندگی کے زوال، ماحولیاتی نقصان اور انسانی رشتوں کی کمزوری کو جنم دیتی ہے۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، منٹو، احمد ندیم قاسمی اور انتظار حسین کے ہاں یہ تضادات مختلف صورتوں میں سامنے آتے ہیں۔

"رحمت خداوندی کے پھول یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو جتنا بڑا شرابی ہے، اتنا ہی بڑا کنجوس بھی ہے۔" (۱۲)

اردو افسانے میں فطرت اور طبقاتی کشمکش کا گہرا تعلق نظر آتا ہے۔ خوشبو، موسم، زمین، کھیت، درخت، پانی، خشک سالی اور بارش جیسے عناصر صرف ماحول کی تشکیل نہیں کرتے بلکہ کرداروں کی نفسیاتی کیفیت، غربت، محرومی اور جدوجہد کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ یہ فطری عناصر بعض اوقات طبقاتی فرق، انسانی محنت، استقامت اور سماجی نابرابری کی علامت بن جاتے ہیں۔

کرشن چندر کے ہاں مزدور اور زمین کا تعلق، راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں دیہی ماحول اور انسانی محنت، جبکہ منٹو کے ہاں شہری زندگی، غربت اور سماجی تضادات نمایاں ہیں۔ 1960ء سے 1980ء کے اردو افسانے میں جدیدیت، طبقاتی کشمکش، شہری و دیہی تضاد اور انسانی نفسیات کو فطرت اور ماحول کے ذریعے علامتی انداز میں پیش کیا گیا، جس سے افسانے کی معنوی گہرائی میں اضافہ ہوا۔



حوالہ جات

- ۱۔ آل احمد سرور، پروفیسر، جدیدیت اور ادب، مرتب، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء، ص ۲۹
- ۲۔ آل احمد سرور، پروفیسر، جدیدیت اور ادب، ایضاً، ص ۲۹
- ۳۔ آل احمد سرور، پروفیسر "جدیدیت اور ادب، ایضاً، ص ۸۱
- ۴۔ آل احمد سرور، پروفیسر، جدیدیت اور ادب، مرتب، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء، ص ۸۱
- ۵۔ ڈاکٹر محمد اشرف کمال، تنقیدی نظریات اور اصلاحات، "نیشنل بک فاؤنڈیشن"، ۲۰۱۹ء، ص ۱۰۳
- ۶۔ شہزاد منظر، کرشن چندر کے دس بہترین افسانے (انتخاب)، بک کارپوریشن، دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۴۷
- ۷۔ راجندر سنگھ بیدی، گرم کوٹ، سٹار پبلیکیشنز، دریانگ، دہلی، س ن، ص
- ۸۔ سعادت حسن منٹو، بو، سعادت حسن منٹو کے دس بہترین افسانے، انتخاب شہزاد منظر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۳ء، ۱۴۵
- ۹۔ "کرشن چندر، "کالو بھنگی" مشمولہ "ایک گرجا، ایک خندق" از کرشن چندر، نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلی کیشنز، مارچ ۱۹۴۸ء، ص ۱۱۰
- ۱۰۔ کرشن چندر، ان داتا، نیا ادارہ، لاہور، س ن، ص ۱۷
- ۱۱۔ احمد ندیم قاسمی، شیش محل، مجموعہ "گھر سے گھر تک" سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۷۲
- ۱۲۔ سعادت حسن منٹو، بو، سعادت حسن منٹو کے دس بہترین افسانے، انتخاب شہزاد منظر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۳ء، ۱۴۵